شمس الرحمن فاروقی کے تنقیدی افکار

کلیدی الفاظ: شمس الرحمن فاروقی # تنقیدی افکار # جدیدیت # کلاسیکی سرمائے # تنقید مغرب # حالی

ڈاکٹر قسیم اختر
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو
مارواڑی کالج، کشن گنج (بہار) 855107

تلخیص ہمارے ادب میں کئی ایک ناقدین ایسے بھی ہیں جنھوں نے مغرب کا مطالعہ تو کیا ہے یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ علم میں اضافے کے لیے مغربی ناقدین کی طرف رجوع کیا، مگر احساس وادراک تک اپنے مطالعے کو نہیں پہنچایا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایسے ناقدین گفتگو کرتے ہیں تو مغرب کی مداحی نظر آتی ہے اور مشرق کی بیخ کنی۔ گویا ان کے مطالعے کے دو زاویے ہوتے ہیں، ایک زاویہ مشرق مشرق کی گردان سے جڑتا ہے اور دوسرا مغرب مغرب کے ورد سے۔ گویا ایسے ناقدین مشرقی اور مغربی نظریات کو مدغم کرتے ہوئے کوئی نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش نہیں کرتے ہیں۔ شمس الرحمن فاروقی نے جس طرح مشرق کو پیا اور ہضم کیا، اسی طرح انھوں نے مغرب کو اپنے اندر انڈیلا اور پھر منتھن کرتے ہوئے نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دوسرے ایسے ناقدین سے ممتاز نظر آتے ہیں جنھوں نے مغرب کا بھی گہرا مطالعہ کیا۔ فاروقی کی تنقید کی یہ بھی خوبی ہے کہ انھوں نے مغربی ناقدین پر بھی اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ورنہ تو اردو کے جن ناقدوں نے مغرب سے استفادہ کیا، انھوں نے عموماً مرعوبیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ مگر شمس الرحمن فاروقی نے مغربی ناقدین سے استفادہ ضرور کیا، ساتھ ہی ان کے نظریات پر بحث بھی کی ہے۔ اس اعتبار سے فاروقی کی تنقید اہم ہو جاتی ہے۔ فاروقی کے علاوہ دیگر ناقدوں نے مغربی ناقدین کا حوالہ عموماً اپنے قول یا مضمون کو مستند بنانے کے لیے دیا، مگر فاروقی نے نہ صرف مغربی ناقدین کے اقوال سے اپنے مضامین کو مستند بنانا بلکہ مغربی ناقدین پر سخت اعتراضات بھی کیے۔ ساتھ ہی انھوں نے مغربی

دنیا کو یہ بھی بتایا کہ جو بحث مغرب میں آج ہو رہی ہے وہ مشرق میں پہلے ہی کسی نہ کسی سطح پر شروع کی جا چکی تھی۔ اس طرح مشرق و مغرب کا موازنہ بھی ہوتا ہے اور مشرقیت کی فوقیت بھی ثابت ہوتی ہے۔

شمس الرحمن فاروقی نے ''شعر غیر شعر اور نثر'' اور ''شعر شور انگیز'' میں متعدد مقامات پر ایسی گفتگو کی جس سے ان کی علمیت، استحضار علمی، تجزیاتی ہنرمندی اور موازناتی کمالات ظاہر ہوتے ہیں۔ مذکورہ تمام رویوں کو سامنے رکھتے ہوئے جہاں وہ فن پاروں کا تجزیہ کرنے کے بعد کوئی نہ کوئی مقام متعین کرتے ہیں، وہیں کلیہ سازی کا بھی فریضہ انجام دیتے ہیں۔

ادب پاروں کو پرکھنے کے لیے شمس الرحمن فاروقی نے اپنا ایک مخصوص نظریہ وضع کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید کے مصلحانہ رویوں سے کہیں زیادہ ان کا مفکرانہ شعار ہمیں متوجہ کرتا ہے۔ مفکر اور مصلح میں ایک بڑا واضح فرق یہ ہوتا ہے کہ مصلح انحرافی رویوں سے کام نہیں لیتا، جب کہ مفکر پہلے انحراف کی مثال پیش کرتا ہے اور خیال و نظر کی دنیا میں تلاطم برپا کرتے ہوئے اپنی ایک بنیاد بناتا ہے اور اُسی بنیاد پر اپنی فکر کا ہیولی تیار کرتا ہے۔ اسی طرح مفکر کے قول میں جدت نظر آتی ہے اور اس جدت سے بسا اوقات اختلاف کا دروازہ بھی کھلتا ہے، تاہم اکثر اس کی نظریہ سازمہم میں بے شمار لوگ شامل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ شمس الرحمن فاروقی کی تنقید کا مفکرانہ اسلوب، ایک ایسا اسلوب ہے جس سے ہم اختلاف کے باوجود قائل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ کیوں کہ ان کی تنقید میں فقط تجزیاتی عوامل کی کارفرمائی نظر نہیں آتی بلکہ ان کی علمیت، تجزیے کو محاکمے کے درجے تک پہنچا دیتی ہے۔ تنقید اپنے آپ میں کوئی حکمیہ لب ولہجہ اختیار نہیں کرتی، تاہم فاروقی کی تنقید ان کی علمیت کی وجہ سے حکمیہ انداز میں بدل جاتی ہے۔ جیسا کہ میر کے مطالعے کے دوران کبھی کبھی وہ ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف کسی نئے میر کو دریافت کر رہے ہیں بلکہ انھیں بہت واضح کرنے کے لیے دوسرے شعرا کو بعض اوقات بہت چھوٹا بھی ثابت کر دیتے ہیں۔ جب بھی ان کی تنقید میں ایسے لمحات آتے ہیں، وہاں

دراصل ان کی علمی انانیت بولنے لگتی ہے۔ ظاہر ہے علمی انانیت کی وجہ سے بنے بنائے کلیوں پر حرف آتا ہے اور اس طرح مطالعہ کا ایک نیا طریقہ بھی سامنے آجاتا ہے۔

فاروقی کی تنقید کے مطالعے کے بعد دو باتوں پر خصوصی طور پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اول یہ کہ جدیدیت کی علمبرداری کرتے ہوئے انھوں نے ادب میں اپنا ایک خاص مقام بنایا ہے؟ یا پھر کلاسیکی سرمایوں پر انھوں نے جو گہری نظر ڈالی، اس نے انھیں شہرت دوام عطا کی؟ مذکورہ دونوں سوالات اپنے آپ میں اہم ہیں۔ ان سوالات کے مدنظر شمس الرحمن فاروقی کے ادبی سفر کا بہترین محاکمہ کیا جاسکتا ہے۔ البتہ سردست یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اگر فاروقی یکسوئی سے کلاسیکی سرمایوں کی طرف توجہ نہیں دیتے تو ان کی انفرادی شان مستحکم نہیں ہوسکتی تھی۔ کیوں کہ جدیدیت میں ایک سے ایک شاعر اور ایک سے ایک افسانہ نگار سامنے آئے۔ شمس الرحمن فاروقی نے انھیں اپنے رسالے ''شب خون'' کے صفحات سے قوت پرواز عطا کی، مگر دیکھتے دیکھتے جدیدیت کی آندھی میں بہت سے ادیب نہ جانے کہاں اڑ گئے۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ فاروقی صاحب فقط جدیدیت کی مہم سازی کرتے رہتے اور کلاسیکی سرمایوں پر نظر نہیں ڈالتے تو ان کی وہ عظمت نہیں رہتی جو آج باقی ہے۔ کلاسیکیت کی طرف رجوع کرنے کے بعد انھوں نے گہرائی سے بہت سی مشرقی اور مغربی روایات کا موازنہ کیا اور تحسین آمیز نظروں سے قدیم سرمایوں کا جائزہ لیا، اس طرح ان کی انفرادیت بھی واضح ہوتی چلی گئی اور اردو کا قدیم سرمایہ پرکشش نظر آنے لگا۔ گویا ان کے یہاں قدیم وجدید اور مشرق ومغرب کا ایک جدید اسلوب ابھر کر سامنے آیا۔ یہی وجہ ہے کہ پروفیسر نثار احمد فاروقی کچھ یوں لکھتے ہیں:

> ''شمس الرحمن فاروقی کی تنقید اصطلاحوں کی اسیر نہیں۔ وہ مشرقی اصول نقد اور شعریات سے بھی عالمانہ واقفیت رکھتے ہیں اور مغربی ادب، خصوصا مغرب کے جدید ترین رجحانات سے بھی باخبر رہتے ہیں۔ ان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہمارے کلاسیکی سرمائے کے صحت مند حصے کے بھی قدر دان ہیں اور جدید ادب کی تفہیم اور ہمت افزائی میں بھی انھوں نے

قائدانہ رول ادا کیا ہے۔ انگریزی ادب کا مطالعہ بعض
دوسرے ناقدوں نے بھی کیا ہے، مگر ان کا عربی وفارسی کے
سرمائے سے اتنا گہرا رابطہ نہیں رہا جتنا شمس الرحمن فاروقی
کی تحریروں سے ظاہر ہے۔''(1)

یہ سچی بات ہے کہ فاروقی نے مغربی ادب کا خاصا مطالعہ کیا تھا۔ اگر وہ فقط مغربی افکار ونظریات کا اظہار کرتے رہتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ وہ مغربی ناقدین کے سرمایوں کا فقط ترجمہ پیش کررہے ہیں یا پھر یہ کہا جاسکتا تھا کہ وہ مشرقی چیزوں کا مغرب سے موازنہ کررہے ہیں، مگر انھوں نے ایسا قطعاً نہیں کیا بلکہ مغرب کو مغرب کے تناظر میں دیکھا اور کوئی نہ کوئی نتیجہ اخذ کیا۔ پھر مشرقی ادب پاروں کو مشرقی تناظر میں پرکھا اور کوئی نہ کوئی نتیجہ اخذ کیا۔ اس کے بعد انھوں نے مشرقی اور مغربی نتائج کو سامنے رکھتے ہوئے ادبی کلیہ وضع کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح فاروقی کے یہاں ادب کو پرکھنے کا ایک نیا طریقہ سامنے آیا۔

ہمارے ادب میں کئی ایک ناقدین ایسے بھی ہیں جنھوں نے مغرب کا مطالعہ تو کیا ہے یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ علم میں اضافے کے لیے مغربی ناقدین کی طرف رجوع کیا، مگر احساس وادراک تک اپنے مطالعے کو نہیں پہنچایا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایسے ناقدین گفتگو کرتے ہیں تو مغرب کی مداحی نظر آتی ہے اور مشرقی کی بیخ کنی۔ گویا ان کے مطالعے کے دو زاویے ہوتے ہیں، ایک زاویہ مشرق مشرق کی گردان سے جڑتا ہے اور دوسرا مغرب مغرب کے ورد سے۔ گویا ایسے ناقدین مشرقی اور مغربی نظریات کو مدغم کرتے ہوئے کوئی نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش نہیں کرتے ہیں۔ شمس الرحمن فاروقی نے جس طرح مشرق کو پیا اور ہضم کیا، اسی طرح انھوں نے مغرب کو اپنے اندر انڈیلا اور پھر منتھن کرتے ہوئے نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دوسرے ایسے ناقدین سے ممتاز نظر آتے ہیں جنھوں نے مغرب کا بھی گہرا مطالعہ کیا۔ فاروقی کی تنقید کی یہ بھی خوبی ہے کہ انھوں نے مغربی ناقدین پر بھی اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ورنہ تو اردو کے جن ناقدوں نے مغرب سے استفادہ کیا، انھوں نے عموماً مرعوبیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ مگر شمس الرحمن

فاروقی نے مغربی ناقدین سے استفادہ ضرور کیا، ساتھ ہی ان کے نظریات پر بحث بھی کی ہے۔ اس اعتبار سے فاروقی کی تنقید اہم ہوجاتی ہے۔ فاروقی کے علاوہ دیگر ناقدوں نے مغربی ناقدین کا حوالہ عموماً اپنے قول یا مضمون کو مستند بنانے کے لیے دیا، مگر فاروقی نے نہ صرف مغربی ناقدین کے اقوال سے اپنے مضامین کو مستند بنانا بلکہ مغربی ناقدین پر سخت اعتراضات بھی کیے۔ ساتھ ہی انھوں نے مغربی دنیا کو یہ بھی بتایا کہ جو بحث مغرب میں آج ہورہی ہے وہ مشرق میں پہلے ہی کسی نہ کسی سطح پر شروع کی جاچکی تھی۔ اس طرح مشرق ومغرب کا موازنہ بھی ہوتا ہے اور مشرقیت کی فوقیت بھی ثابت ہوتی ہے۔

شمس الرحمن فاروقی نے ''شعر غیر شعر اور نثر'' اور ''شعر شور انگیز'' میں متعدد مقامات پر ایسی گفتگو کی جس سے ان کی علمیت، استحضار علمی، تجزیاتی ہنرمندی اور موازناتی کمالات ظاہر ہوتے ہیں۔ مذکورہ تمام رویوں کو سامنے رکھتے ہوئے جہاں وہ فن پاروں کا تجزیہ کرنے کے بعد کوئی نہ کوئی مقام متعین کرتے ہیں، وہیں کلیہ سازی کا بھی فریضہ انجام دیتے ہیں۔ اس حوالے سے ذیل کا اقتباس قابل اعتبار ہے:

> ''حالی کے ایک عرصہ بعد پہلی مرتبہ شعر کی نئے انداز سے تعریف کی گئی اور شعر کی ماہیت پر تفصیل کے ساتھ نظریاتی بحث کی گئی۔ مضمون کا انداز اس حد تک منطقی اور تجزیاتی ہے۔۔۔۔ شمس الرحمن فاروقی نے شاعری کے لیے معروضی معیار مقرر کیے۔ یہ ایسے معیار تھے جن کی روشنی میں فن پارے کو سمجھا اور پرکھا جاسکتا تھا۔ شعر کی تعریف میں دو نئے عناصر'' ابہام'' اور ''جدلیاتی'' لفظ کا اضافہ ہوا اور ان دونوں کے فن کارانہ استعمال کو ادبیت یا شعریت کا معیار تسلیم کیا گیا۔''(2)

یہ سچی بات ہے کہ اردو ناقدوں نے ادب پاروں کے تجزیوں میں تشریح سے زیادہ کام لیا ہے۔ عملی تنقید کے دوران زبان وبیان اور دیگر مباحث سے زیادہ سروکار رکھا ہے، مگر فاروقی نے تجزیے کے علاوہ فن پاروں کو پرکھنے کے لیے بہت سے ایسے اصولوں کی طرف اشارے کیے جن کی طرف ہمارے ناقدوں نے اشارے نہیں کیے۔ گویا

فاروقی کا طریقۂ کار رہا ہے کہ انھوں نے فن پاروں کے تجزیاتی عمل کے دوران وضع اصطلاحات کا بھی کام کیا اور پرانی اصطلاحات کی تشریح کر کے ان میں ایک نئی جان پیدا کر دی اور ساتھ ہی ان اصطلاحوں کو فن سے جوڑ کر نئے نئے معانی دریافت کرنے کی کوشش کی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ نظریاتی بحث کے دوران مشرقی اور مغربی حوالوں پر گفتگو کرتے ہوئے وہ اپنا موقف واضح کرتے ہیں:

> ''خود حالی کی یہ اصول بندی کہ شاعری اصلیت سادگی اور جوش سے عبارت ہے، ملٹن کو غلط سمجھنے کا نتیجہ تو ہے ہی لیکن اس غیر منطقی بے اصول تعین کی بھی مثال ہے جس کا الزام انھوں نے خلیل ابن احمد پر رکھا ہے۔ خلیل ابن احمد کا یہ قول نقل کر کے کہ اچھا شعر وہ ہے جس کا قافیہ پورا کرنے سے پہلے سامع کے ذہن میں آجائے۔۔۔ لیکن یہی بات سادگی، اصلیت اور جوش پر بھی صادق آتی ہے، اور یہ بھی کہ ان میں سے کوئی صفت ایسی نہیں ہے جو صرف شعر سے مختص ہو۔''(3)

مذکورہ اقتباس میں حالی، ملٹن اور خلیل ابن احمد کا جس طرح حوالہ دیا گیا وہ دراصل ان کے استحضارِ علمی اور یادداشت کا نمونہ ہے۔ شمس الرحمن فاروقی نے تقریباً ساٹھ صفحات پر مشتمل ''شعر غیر شعر اور نثر'' والے مضمون میں جس طرح نظریاتی بحث کی، وہ اردو تنقید میں شاذ ہی نظر آتی ہے۔ کیوں کہ انھوں نے اس میں شاعری کی شعریات اور نثری خصوصیات کے درمیان ایک واضح لکیر کھینچتے ہوئے دونوں کی اچھی وضاحت کی اور یہاں تک کہا کہ آگ کا دریا تیس فیصدی شاعری ہے۔ کیوں کہ قرۃ العین کی نثر میں غنائیت اور لفظی انتخاب کا جو رویہ پایا جاتا ہے، وہ دراصل شاعرانہ احساس سے قریب کر دیتا ہے۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ شمس الرحمن فاروقی نے بہت ہی واضح انداز میں ادب پاروں کا لسانیاتی مطالعہ تو نہیں کیا تاہم انھوں نے بہت سے مقامات پر لسانیاتی اور اسلوبیاتی اشارے کیے ہیں، جنھیں ہم اردو کی اسلوبیاتی تنقید کے زمرے میں رکھ سکتے ہیں۔ اسلوبیاتی تنقید کے حوالوں سے مسعود حسین خان، پروفیسر گوپی چند نارنگ،

مغنی تبسم اور مرزا خلیل احمد بیگ کا نام نمایاں طور پر لیا جانا بجا ہے، لیکن ان ناموں میں شمس الرحمن فاروقی کا اضافہ بھی ضروری ہے۔ کیوں کہ جب وہ شعر کی شعریات اور نثری خصوصیات کی بخیہ گری کرتے ہیں تو ایک اسلوبیاتی ناقد نظر آتے ہیں۔ شمس الرحمن فاروقی نے میر کی زبان کی انفرادیت ثابت کرنے کے لیے جس انداز سے بحث کی، وہ بحث دراصل لسانیات، اسلوبیات اور تنقید کو باہم مدغم کرتی ہے۔ میر کے لسانی پہلوؤں پر فاروقی نے جو اشارے کیے انھیں ذیل میں پیش کرنا مناسب ہے، تاکہ ان کی تنقید کا اسلوبیاتی پہلو بھی سامنے آجائے:

> ''ہماری زبان کے الفاظ کا بڑا ذخیرہ پراکرت الفاظ پر مبنی ہے، اس لیے بادی النظر میں میر کا کلام ہمیں آسان اور گھریلو معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ میر کے یہاں لامحالہ پراکرت الفاظ دوسرے شعرا کی بہ نسبت زیادہ ہیں۔ میر کا کلام ہمیں اس لیے بھی گھریلو معلوم ہوتا ہے کہ زبان کے بہت سے استعمالات جو انھوں نے روا رکھے وہ اب عوامی یا نیم خواندہ طبقے ہی میں سنائی دیتے ہیں۔ اس بنا پر ہمیں دھوکا ہوتا ہے کہ ہم ایسے شاعر کا کلام پڑھ رہے ہیں جو بہت سادہ مزاج، غیر پیچیدہ اور کچھ ہم ہی لوگوں جیسا، معمولی دماغ والا ہے، حقیقت اس کے برعکس ہے۔''(4)

شمس الرحمن فاروقی نے مذکورہ اقتباس میں جس انداز سے میر کی انفرادیت ثابت کرنے کی کوشش کی، وہ بہت خوب ہے۔ کیوں کہ پراکرت میں میر نے جو انحراف کیا اور عربی الفاظ کو جس طرح استعمال میں لایا، ان خصوصیات کو فاروقی نے بڑے ہی حسین انداز میں زیر بحث لایا اور اس سے میر کی لسانی انفرادیت ثابت کی۔ شمس الرحمن فاروقی نے پراکرت کے استعمال میں میر کی انفرادیت ثابت کر کے ان کے یہاں نئے معنی بھی متعین کیے۔ اس طرح دیکھا جائے تو شمس الرحمن فاروقی نے لسانیاتی مطالعے کی طرح فقط الفاظ کی گنتی نہیں کی کہ کس شاعر نے کون سا لفظ کتنی مرتبہ استعمال کیا اور کن الفاظ کے استعمال کی وجہ سے کس کی انفرادیت ثابت ہوتی ہے۔ اسی طرح فاروقی نے معکوسی

اور ہکاری الفاظ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسلوبیاتی مطالعہ نہیں کیا ہے۔ اس لیے یہ کہنا بجا ہوگا کہ انھوں نے لسانیات، اسلوبیات اور تنقیدی شعور کو ایک ساتھ ملاتے ہوئے مطالعے کا ایک نیا طریقہ دریافت کیا ہے۔ ان کے اسی طریقۂ کار سے ان کی انفرادیت ثابت ہوتی ہے۔ تنقید کے کسی مکتبہ فکر میں فقط الفاظ کی گنتی سے کوئی سروکار نہیں رکھا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ تنقید معروضی ہونے کے باوجود اپنے اندر لچک رکھتی ہے۔ اس لیے لسانیاتی اعداد وشمار کی یہ متحمل نہیں ہوسکتی۔ اسی بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے شمس الرحمن فاروقی نے اپنے مطالعے کا ایک نیا انداز پیدا کیا۔

فاروقی کی تنقید کا گہرائی سے مطالعہ کرنے سے کئی باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔ اول، گذشتہ پانچ دہائیوں میں کم وبیش ہر بڑے ادبی مسئلے پر انھوں نے کوئی نہ کوئی انوکھی رائے پیش کی ہے۔ اسی طرح وقفے وقفے سے مروجہ ادبی تاریخ پر نیا نظریہ دیا ہے۔ ولی کی دہلی آمد بھی ادبی تاریخ کا ایک اہم موضوع رہا ہے۔ کیوں کہ اس سے ادبی سیاست کا ایک باب جڑا ہوا ہے۔ اگر سعد اللہ گلشن اور ولی کے تعلقات مضبوط ہیں تو گلشن کے مشورے کی اہمیت بڑھ جاتی ہے، مگر اورنگ آباد کے بہت سے لوگ اس بات کو خاطر میں لاتے ہی نہیں کہ گلشن کے مشورے سے ولی کی شاعری میں کوئی انقلاب آیا۔ فاروقی نے اس حوالے سے جو نظریہ پیش کیا، وہ اورنگ آباد کے لوگوں کے موافق ہے۔ حالاں کہ جمیل جالبی سمیت دیگر محققین نے گلشن اور ولی کے مشورے کو اہمیت دی ہے۔ فاروقی نے ولی کی آمد اور اس کے متعلقات پر نئی بحث کرتے ہوئے گویا مروجہ تاریخ پر چوٹ کی ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو فاروقی کی تنقید میں تحقیق کا یگ گونہ حصہ ہے۔ جس طرح فاروقی لغات کے سہارے اپنی تنقید کو معراج عطا کرتے ہیں، اسی طرح وہ تاریخ کا سہارا لیتے ہوئے تنقید کے تئیں اپنا نکتہ واضح کرتے ہیں۔ ہماری تنقید یا تو مغربی نظریات پر آگے بڑھتی ہے یا پھر زبان وبیان کی خوبی وخامی کو زیر بحث لاتی ہے، لیکن فاروقی نے لغوی مسائل کو اصطلاح میں مدغم کیا ہے اور اس سے تشریح وتنقید میں مدد لی۔ اس طرح ان کی انفرادیت واضح ہوتی ہے۔ مغرب ومشرق، تاریخ ولغت کے بعد فاروقی جو رائے قائم کرتے ہیں، وہ رائے نہ صرف متاثر کرتی ہے بلکہ ایک حد تک

ہمیں قائل بھی کرلیتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جب ہم ان کی تنقیدی سحر کاری سے نکلتے ہیں تو ان کے متعین کردہ معنی ومفہوم پر سوالات بھی اٹھاتے ہیں،لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ جب ہم ان کو پڑھتے ہیں تو پڑھتے چلے جاتے ہیں اور قائل ہوتے رہتے ہیں۔ کیوں کہ مشرق اور مغرب، قدیم اور جدید، روایتی اور غیر روایتی امور کا چوکھا رنگ فاروقی کی تنقید میں نظر آتا ہے۔ان کے تجزیے میں ان کی علمیت اور وسعت مطالعہ رنگ آمیزی کرتی ہے۔ان کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ وہ متون سے الگ ہوکر کوئی بحث نہیں کرتے۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی بھی متن پر کوئی مفروضہ قائم کرتے ہیں تو اس کو ثابت کرنے کے لیے مختلف زبانوں سے حوالے اکٹھے کرتے ہیں۔مختلف آراء پیش کرتے ہیں اور اس طرح تمام حوالوں اور رایوں کو اپنے مفروضے میں پیوست کر لیتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بات جہاں سے شروع ہوئی تھی، اسی نکتہ پر آ کر ٹھہر گئی ہے اور ایک نئے معنی کے ساتھ آگے کا سفر شروع ہوتا ہے۔ان کی تنقیدی انفرادیت کے ضمن میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ تاریخ کو تنقید میں مدغم کرنا ان کا ایک منفرد کارنامہ ہے۔ مروجہ ادبی تاریخ پر نئے زاویے سے سوچنا اور نئی بحث کو جنم دینا ان کا ناقدانہ شعار تھا۔اسی طرح لسانیاتی، اسلوبیاتی اور تنقیدی معاملات کو مدغم کرتے ہوئے مطالعے کا کوئی نیا رخ دینا ان کا مطمح نظر ہوتا تھا۔ اپنی ان خصوصیات کی بنیاد پر وہ گذشتہ چار پانچ دہائیوں میں اپنی تنقید سے لوگوں کو متوجہ کرتے رہے اور مستقبل میں ان کے متعین کیے گئے حدود وخطوط پر چلنا بھی مستحسن ادبی سفر سمجھا جائے گا۔

(1) پروفیسر نثار احمد فاروقی، شعر شور انگیز پر ایک نظر، مشمولہ: شمس الرحمن فاروقی، شخصیت اور ادبی خدمات، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، جامعہ نگر نئی دہلی، 1994، ص، 94۔

(2) شمس الرحمن فاروقی، شخصیت اور ادبی خدمات، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، جامعہ نگر نئی دہلی، 1994، ص 166۔

(3) شمس الرحمن فاروقی، شعر، غیر شعر اور نثر، این سی پی یو ایل، نئی دہلی، 2005 طبع سوم، ص 39۔

(4) شمس الرحمن فاروقی، شعر شور انگیز، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ص 78۔

☆☆☆